بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اشارات

جسٹس قدیر الدین صاحب کے مقالے پر معروضات کا جو سلسلہ ترجمان القرآن کے گذشتہ شمارے میں شروع کیا گیا تھا اُسے بعض دوسرے اہم موضوعات کی وجہ سے روکنا پڑا ہے۔ آئندہ شمارے میں انشاءاللہ اسے پھر جاری کر دیا جائے گا۔

---

شیرپاؤ کے قتل سے حکومت جس طرح ناجائز سیاسی فوائد حاصل کرنے میں مصروف ہے وہ اپنی جگہ کتنے ناپسندیدہ ہی سہی لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ اس آسمان کے نیچے اس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ کسی بے گناہ انسان کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔ قرآن مجید نے ایک شخص کے قتلِ ناحق کو پوری نوعِ انسانی کے قتل سے تعبیر کیا ہے۔ ہمیں اس قتل سے اُتنا ہی صدمہ پہنچا ہے جتنا کہ کسی بے گناہ کے قتل سے ہو سکتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ہمارے سینے کے وہ زخم بھی ہرے ہو گئے ہیں جو ڈاکٹر نذیر احمد، خواجہ رفیق، عبدالصمد اچکزئی، مولانا شمس الحق اور اسی طرح کے بعض دوسرے بے گناہوں کے قتل سے لگے تھے۔ ہم اس خوفناک رجحان کو سخت تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس دن سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ جس دن ہمارے مُلکی مسائل افہام و تفہیم کے بجائے "قاطعِ شمشیر" کے ذریعے حل ہونے لگیں۔ مرحوم شیرپاؤ کے قتل کے سلسلے میں ہر سوچنے سمجھنے والے دماغ میں چند سوالات ضرور اُبھرتے ہیں جن کے صحیح اور تشفی بخش جوابات کے بغیر دلوں کی خلش دُور نہیں ہو سکتی۔

---

حکومت کے اپنے ذرائع ابلاغ کی وساطت سے ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ کابل ریڈیو کئی دنوں سے شیرپاؤ

کے قتل کی دہائی دے رہا تھا اور اس روح فرسا حادثہ سے پہلے بھی ان پر تین چار بار قاتلانہ حملے ہو چکے تھے۔ ہمیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم حکومت کی ان اطلاعات کے بارے میں کوئی شک کریں۔ اگر فی الحقیقت شیر پاؤ کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق تھا تو اس قیمتی جان کے تحفظ کے لیے، جو نہ صرف برسر اقتدار طبقہ کی منظورِ نظر تھی بلکہ انتظامیہ پر پورا اختیار رکھتی تھی، کیا انتظامات کیے گئے؟ ذہن ان انتظامات کی تفصیل سننے کے لیے بیقرار ہیں۔ وہ کوئی عام کارکن نہ تھے کہ بغیر سرکاری حفاظتی دستوں کے یونیورسٹی کی تقریب میں چپکے سے چپکے چلے گئے اور وہاں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس تقریب میں شرکت کے لیے انہیں پہلے باقاعدہ دعوت دی گئی ہوگی اور ان کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد ہی اس کے انعقاد کا اعلان ہوا ہوگا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ظالمانہ حرکت اس تقریب کے منتظمین اور شرکا میں سے تو کوئی نہ کر سکتا تھا کیونکہ یہ ان کے لیے بھی اسی طرح جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی جس طرح کہ شیر پاؤ کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ اس سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ بم نہ صرف حاضرین بلکہ منتظمین کے آنے سے بیشتر ہی رکھا گیا تھا۔ سکیورٹی کے ذمہ دار افراد جو ایسے موقعوں پر غیر معمولی سرگرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں، انہوں نے آخر اس خاص موقع پر کیوں مجرمانہ تغافل سے کام لیا خصوصاً جب کہ انہیں اس بات کا بھی علم تھا کہ جس وزیر باتدبیر کو موت کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں اس کا براہ راست تعلق اُن کے محکمے ہی سے ہے۔ اخبارات کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بم کے دھماکہ کے فوراً بعد بھی پولیس نے حادثہ کے اس مقام کی طرف رجوع نہ کیا اور طلبہ ہی شیر پاؤ کو شدید زخمی حالت میں اٹھا کر باہر لائے اور جب انہیں ہسپتال میں لے جانے کا انتظام ہو چکا تو پھر پولیس کو وہاں پہنچنے کی توفیق نصیب ہوئی۔

---

شیر پاؤ کی موت کے بعد حکومت نے مخالف سیاسی جماعتوں خصوصاً نیپ کے بارے میں جو نا روا طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے اس سے شکوک و شبہات میں مزید اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ حکومت کی طرف سے بار بار یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ نیپ ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حکومت کا یہ الزام درست ہے تو اسے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر کے باقاعدہ سزا دلوانے کا التزام کیوں نہ کیا گیا؟ اور اگر یہ سب کچھ خاموش تماشائی بن کر برداشت کیا جا رہا تھا تو اب کونسی جلدی تھی کہ شیر پاؤ کے قتل کے ساتھ ہی اُسے کچل دینے کی کوششیں شروع ہوئیں؟ اگر حکومت ماضی میں صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے اس جماعت کو اصلاح کے مواقع فراہم کر رہی تھی تو اب اصلاح کے موقع سے اسے اس قدر عجلت کے ساتھ کیوں محروم

کر دیا گیا؟ جب معاملہ سپریم کورٹ میں پیش کیا جانا ہی تھا تو کیا یہ بہتر اور موزوں نہ تھا کہ عدالتِ عظمٰی کے فیصلے کے بعد ہی اس جماعت کے خلاف کوئی کارروائی کی جاتی۔ جہاں اس کی "ملک دشمن سرگرمیوں" کو اتنی مدت تک برداشت کیا گیا وہاں پندرہ بیس دن کی "تاخیر" سے آخر کونسی قیامت ٹوٹ پڑنے کا خدشہ تھا۔

---

دلوں کے حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حکومت کے منصب پر فائز بعض اُونچی شخصیتوں نے شیرپاؤ کے قتل پر ایسا ردِعمل ظاہر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس قتل سے جس قدر صدمہ پہنچا ہے اس سے کہیں زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی ہے کہ انہیں اپنے مخالفین کو تہس نہس کرنے کا زرّیں موقع ہاتھ لگا ہے۔ خان قیوم کے لیے تو اپنے ان جذبات مسرت کو چھپانا مشکل ہو رہا ہے۔ انہوں نے ۱۸ فروری کو پشاور میں گورنر راج کے نفاذ پر جس شادمانی کا اظہار کیا اُس سے اُن کے دل کی کیفیت کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پھر خان صاحب کے ساتھ وزیر تعلیم عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب کا یہ ارشاد کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ اُن کے اقدام کی توثیق ہی کرے گا نہ صرف ان حضرات کے اندرونی عزائم کا پتہ دیتا ہے بلکہ اس حقیقت کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ اِن لوگوں کو نشۂ اقتدار نے اس مقام پر پہنچا دیا ہے، جہاں انہیں اپنے منہ سے نکالے ہوئے الفاظ کی اہمیت کا کوئی احساس باقی نہیں رہا۔ اُن کے جی میں جو آتا ہے بلا تکلف کہتے چلے جاتے ہیں اور یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے کہ وہ ترنگ میں آ کر جو کچھ ارشاد فرما رہے ہیں اسے اِس ملک کے لوگ ہی نہیں بلکہ باہر کی دنیا بھی سُن رہی ہے اور ان کے ان فرمودات ہی سے بیرون ملک ہمارے مستقبل کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جا سکے گی۔ اگر یہ حضرات مسندِ اقتدار پر ہمیشہ کے لیے براجمان رہنے کا عزم رکھتے ہیں تو اِس کے لیے انہیں کوئی قرینہ بھی سیکھنا چاہیئے۔ اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ بیانات سے سیاسی وقار بڑھتا نہیں بلکہ گھٹتا ہے۔

---

یہ حقیقت سورج سے زیادہ روشن ہے کہ معاشرے میں اس شخص کی قطعاً کوئی وقعت باقی نہیں رہتی جو کسی ضابطۂ اخلاق کا پابند نہ ہو کیونکہ اگر وہ کسی اصول کی پابندی کرنے پر آمادہ نہ ہوگا تو اس کے طرزِعمل کے بارے میں کچھ اندازہ نہ ہو سکے گا۔ ایک دیوانے اور ہوشمند انسان کے مابین ظاہری اعمال کے لحاظ

سے سب سے نمایاں فرق یہی ہوتا ہے کہ ہوشمند فرد کی طبیعت میں ٹھہراؤ کے علاوہ ایک طرح کی ہمواری اور استواری بھی پائی جاتی ہے اور انسان اُسے دیکھ کر یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ خاص حالات میں کونسا ردِ عمل ظاہر کرے گا۔ اس کے مقابلے میں ہوش و خرد سے عاری فرد کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس وقت کیا حرکت کر بیٹھے۔

افراد کی طرح قوموں کا اور مُلکوں کا وقار بھی اجتماعی ضابطہ اخلاق یعنی دستور اور آئین سے وابستہ ہوتا ہے۔ دستور ہی کسی قوم کا نصب العین اور پھر اس نصب العین کے حصول کے لیے جدوجہد کے خطوط متعین کرتا ہے۔ اسی دستور کی مدد ہی سے حکومت اور عوام کے مابین حقوق و فرائض کا تعین ہوتا ہے۔ پھر اس دستور کی وجہ سے کسی قوم کے اندر اچھی روایات پرورش پاتی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب کوئی قوم ایک طویل مدّت تک اپنے آپ کو ایک خاص ضابطے کی پابند بنا کر سرگرمِ عمل رہے تو اس کے دل و دماغ میں ان ضابطوں کی پابندی اس طرح رچ بس جاتی ہے کہ اس کے افراد قانونی گرفت کے خوف کے بغیر ہی ان کی پابندی کرتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح حکومت اور عوام دونوں کو اطمینانِ قلب کے ساتھ اپنی قوتوں کو تعمیری راہ پر لگانے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ اس سے ملک کے اندر استحکام پیدا ہوتا ہے اور بیرونِ ملک قوم کا وقار بڑھتا ہے۔ اس بنا پر دنیا کی کوئی مہذب قوم اس بات کو گوارا نہیں کرتی کہ وہ جس زمین پر آباد ہے وہ زمین بے آئین رہے اور اس کے عوام اور سربراہ کسی ضابطے کے پابند نہ ہوں کیونکہ دستور اور آئین سے بے نیازی کے معنی تو یہ ہیں کہ وہ قوم جنگل کے قانون کے تحت زندگی بسر کر رہی ہے۔ لہٰذا دستور ہر مہذب اور باوقار قوم کی بنیادی ضرورت ہے۔ اسے پاکستان کی بدنصیبی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہماری قوم کو ابھی تک اس بنیادی ضرورت کا احساس نہیں ہوا۔ آزادی سے لے کر ۱۹۵۶ء تک یہ ملک بغیر کسی دستور کے ہی زندہ رہا اور اس طرح اس ملک کے حکمرانوں کو من مانی کارروائیاں کرنے کے کھلے مواقع فراہم ہوتے۔ یہاں کے برسرِ اقتدار طبقے عوام کے حقوق کو پامال کرنے میں کس حد تک جری اور بیباک تھے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک سرپھرے اور مفلوج آمر نے نشۂ اقتدار میں بدمست ہو کر ۱۹۵۴ء میں دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا اور اس کے ساتھ ہی پوری کابینہ اور اس کے آئینی سربراہ کو برطرف کر دیا۔ پھر ۱۹۵۵ء میں فیڈرل کورٹ کے حکم کے مطابق جب دستور ساز اسمبلی از سرِ نو معرضِ وجود میں آئی تو اس نے ۱۹۵۶ء میں ایک ایسا دستور تیار کیا جس کو قوم نے چند ترامیم کے ساتھ ملی آرزوؤں کا کسی حد تک ترجمان سمجھتے ہوئے

قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور اس کے مطابق انتخابات کی تیاریاں شروع ہوئیں لیکن عین اُس وقت جب قوم انتخابی سرگرمیوں میں مصروف تھی ۱۹۵۸ء میں مارشل لا نافذ کر کے اسے کالعدم قرار دے دیا گیا۔ ملک پر چار سال تو مارشل لا مسلط رہا بعد ازاں ۱۹۶۲ء میں ایک دستور جس میں قوم کی رائے کو قطعاً کوئی دخل نہ تھا ملک میں ایک آرڈیننس کے ذریعہ نافذ ہوا۔ اس دستور کا مقصد صرف یہ تھا کہ سربراہ مملکت کو مارشل لا کی رُو سے جو وسیع اختیارات حاصل تھے انہیں آئینی جواز فراہم کر دیا جائے مگر عوام نے اسے بھی یہ سوچ کر گوارا کر لیا کہ چلیے اس کے نفاذ سے مارشل لا تو ختم ہو جائے گا اور وہ دنیا کے سامنے یہ کہنے کے قابل ہو جائیں گے کہ ان کے ہاں ایک دستوری اور آئینی حکومت قائم ہے۔

اس دستور کے نفاذ کے بعد عوام کے اندر یہ ولولہ بیدار ہوا کہ وہ اپنے چھینے ہوئے حقوق کی بازیابی کے لیے جدوجہد کریں اور برسرِ اقتدار طبقے کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ دستور کے اندر ایسی ترمیمات کر دے جن سے ان کے بنیادی حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب بڑی مشکل سے اس بات کے لیے تیار ہوئے تھے کہ ۱۹۶۹ء میں پھر ملک مارشل لا کے شکنجے میں آ گیا اور اسی انتشار اور افراتفری کے عالم میں ہمیں نصف ملک سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دلفگار المیہ کے پیچھے بیرونی ہاتھ بھی تھے مگر اس حقیقت کو آخر کس طرح جھٹلایا جا سکتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں دستوری خلا ہونے کی وجہ سے عوام کے اندر یہ تاثر پوری طرح پھیل چکا تھا کہ اس ملک میں انسان تو صرف چند اصحابِ اقتدار ہی ہیں۔ ان مقتدر ہستیوں کے علاوہ جو لوگ بھی اس سرزمین میں آباد ہیں اُن کے کوئی حقوق نہیں۔ اُن کی زندگی کا مقصد محض آقاؤں کی خدمت اور چاکری ہے۔ اس احساس ہی نے ان کے اندر یاس و قنوطیت اور نفرت کو جنم دیا جس سے بالآخر ملک دولخت ہو گیا۔

---

اس خوفناک تباہی کے بعد ملک میں ایک ایسی حکومت قائم ہوئی جس کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی تھی کہ اُسے عوام نے اپنے ووٹوں سے منتخب کیا ہے۔ مگر بدقسمتی سے اس حکومت کے سربراہ وہ شخص بنے جن کے آمرانہ عزائم کسی سے ڈھکے چھپے نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک آئینی سربراہ کی حیثیت سے حلف اُٹھانے کے بجائے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے حلف اُٹھانا پسند کیا اور مارشل لا کو ایک خاص مدت تک نافذ رکھنے پر سخت اصرار کرتے رہے۔ زخموں سے چُور اور خستہ حال قوم نے دل پر پتھر رکھ کر اُن کے

اس صریح ناجائز مطالبے کو مان لیا کیونکہ اُسے یہ ڈر تھا کہ اُن پُر آشوب حالات میں اختلاف کی چنگاریاں کہیں پاکستان کے مغربی حصے کو بھی جلا کر خاکستر نہ کر دیں۔ مارشل لا سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھٹو صاحب نے جس طرح کی آمرانہ کارروائیاں روا رکھیں ان سے پوری دنیا واقف ہے۔ جمہوریت کے "یہ دعویدار" اس بات کے لیے برابر کوشاں رہے کہ اس ملک میں عرصہ دراز تک جمہوریت کی تذلیل ہوتی رہے لیکن عوام کے دباؤ کی وجہ سے جب وہ جنگل کے اس قانون کو خیرباد کہہ کر ایک دستور کے تحت حکومت کرنے پر یکسر مجبور ہو گئے تو انہوں نے ایک ایسا دستور نیار کیا جس میں برسراقتدار طبقے کو زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ اس دستور میں جس قسم کی ناانصافیوں کو تحفظ دیا گیا وہ سب پر عیاں تھیں اور ہر سوچنے سمجھنے والا شخص اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ یہ دستور ایک مسلم قوم کی امنگوں کا ترجمان نہیں ہے لیکن حزبِ اختلاف نے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے اسے محض اس بنا پر قبول کر لیا کہ کسی طرح اس بدنصیب قوم کو مارشل لا کی لعنت سے تو چھٹکارا حاصل ہو۔ حزب اختلاف کی دستور کے بارے میں جو رائے تھی وہ تو سب کے سامنے ہی ہے لیکن برسراقتدار طبقے نے اس کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے اور اس بات کا دعویٰ کیا کہ چشمِ فلک نے آج تک اس سے زیادہ بہتر، اس سے زیادہ جمہوری اس سے زیادہ اسلامی مزاج کا حامل اور اس سے زیادہ جامع و مانع کوئی دوسرا دستور نہیں دیکھا لیکن ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جس طبقے نے اتنے بلند بانگ دعووں کے ساتھ اس دستور کو نافذ کیا تھا اُس نے ڈیڑھ سال کی مدت گذرنے سے پہلے ہی بنیادی مسائل تک میں ترمیم کرنا شروع کر دی۔ حکمران طبقہ اکثریت کے بل بوتے پر جس طرح چاہتا ہے دستور کا حُلیہ بگاڑتا چلا جاتا ہے لیکن طاقت کے زعم میں وہ غالباً اس حقیقت کو بھول رہا ہے کہ اُس کی اس دیدہ دلیری سے ان امور میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا ہے جن میں تھوڑی مدت پیشتر اتفاق رائے ہو چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انتشار کے جس دیو کو قوم نے بڑی مشکل سے پابند سلاسل کیا تھا برسراقتدار طبقہ خود اس کی زنجیریں کھول کر اُسے تباہی مچانے کے لیے آزاد چھوڑ رہا ہے۔

اگر اربابِ حکومت ہی دستور کے تقدس کو پامال کرنے لگیں تو عوام کی نظروں میں اس کا احترام کس طرح باقی رہ سکتا ہے؟ کیا دستور کے معاملے میں ان کی اس غیر سنجیدہ روش سے عوام کے اندر یہ احساس پیدا نہ ہو گا کہ حکمران طبقے کی خواہشات کا نام ہی دستور ہے جو ان کے بدلتے ہوئے مصالح کے ساتھ ساتھ خود بخود تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اگر یہ احساس بڑھتا گیا تو کیا بقول رد سو دستور کے متعلق عوام یہ سمجھنے پر مجبور نہ ہوں گے

کہ جس ضابطے کو یہاں دستور کہا جاتا ہے اس کی حیثیت تو مکڑی کے جالے کی سی ہے جو صرف کمزوروں اور ناتوانوں کو پھانسنے کے لیے بنا گیا ہے ورنہ جہاں تک اصحابِ اقتدار کا تعلق ہے وہ اسے جس وقت چاہتے ہیں توڑ کر رکھ دیتے ہیں اور کوئی اُن سے باز پرس کرنے والا نہیں ہوتا۔ بنیادی اُمور میں حالیہ دستوری ترمیم جن مقاصد کے تحت اور جس جلد بازی اور تیزی سے کی گئی ہیں ان سے عوام کے خدشات میں بہت حد تک اضافہ ہوا ہے اور ارباب اختیار کی بار بار یقین دہانیوں کے باوجود کہ وہ ملک میں یک جماعتی حکومت نافذ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے، اسلام اور جمہوریت کا مستقبل بڑا تاریک پاتے ہیں۔ اگر آپ ان ترامیم پر نگاہ ڈالیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ یہاں بڑی تیزی کے ساتھ جمہوریت کا گلا گھونٹ کر آمریت کی راہ ہموار کی جارہی ہے۔

---

آئین میں شہری آزادیوں کے سلسلے میں عوام کو یہ تحفظ دیا گیا تھا کہ کسی شخص کو ملک دشمن سرگرمیوں کے الزام میں گرفتار کرنے کی صورت میں ایک ماہ بعد لازمی طور پر جائزہ بورڈ کے سامنے پیش کیا جائے۔ اب یہ میعاد ایک ماہ سے بڑھا کر تین ماہ کر دی گئی ہے یعنی حکومت ایک شخص کی آزادی بغیر کوئی وجہ بتائے تین ماہ تک بڑی بے تکلفی کے ساتھ سلب کر سکتی ہے۔ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ایک ترمیم کے ذریعے حکومت کو اس امر کا بھی اختیار دے دیا گیا ہے کہ اگر وہ کسی شخص کے بارے میں یہ محسوس کرے کہ اس کا وجود ملک کی سلامتی، استحکام اور خودمختاری کے لیے خطرہ ہے یا وہ کسی ایسی جماعت کا رکن ہے جو قوم دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہے تو اس کا معاملہ سرے سے جائزہ بورڈ کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حکومت جس شخص کو چاہے نہ صرف گرفتار کر سکتی ہے بلکہ اسے اپنی مرضی کے مطابق غیر معینہ مدت تک جیل میں بھی ڈال سکتی ہے اور کوئی اس سے اس امر کی باز پرس نہیں کر سکتا کہ آخر اس پر یہ ظلم کس جرم کی پاداش میں کیا جارہا ہے۔ اسی ضمن میں دستور کے اندر ایک تبدیلی یہ بھی لائی گئی ہے کہ پہلے حکومت اس بات کی پابند تھی کہ وہ جس شخص کو گرفتار کرے اسے ایک ہفتہ تک اس بات کی اطلاع دی جائے کہ حکومت کی نظروں میں وہ کیوں معتوب ہے۔ اب یہ میعاد ایک ہفتہ سے بڑھا کر پندرہ دن کر دی گئی ہے۔ یعنی حکومت کو یہ حق حاصل ہوگیا ہے کہ وہ جس شخص کو چاہے دو ہفتہ تک قید و بند میں ڈال دے اور اس پابندِ سلاسل شخص کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ اس کے ساتھ یہ ناروا سلوک اس کے کس فعل کی وجہ سے کیا جارہا ہے۔

(باقی بر صفحہ ۴۲)

---